© rasailojaraid.com

اداریہ

مغرب اور اسلام: بدلتے زاویے

انیس احمد

دنیا کی ہر تہذیب وثقافت زمان ومکان کے بارے میں اپنا مخصوص نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ بالعموم تصور زمان ومکان کا تعلق کسی اہم یا مقدس وقوعہ سے ہوتا ہے۔ عیسائیت میں تاریخ کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے یا بنی اسرائیل کے تصور زمان ومکان کا تعلق مصر کے دورِ غلامی سے نجات کے واقعہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی اسلامی تہذیبی وثقافتی روایت نے زمان ومکان کو تاریخ کی مادی تعبیر سے آزاد کرتے ہوئے اور جغرافیائی حدود کو marginalize کرتے ہوئے نیکی، حق، صداقت، عدل وانصاف اور اللہ تعالیٰ کی شعوری اطاعت وبندگی کو مرکزی اہمیت دی اور ''ہجرۃ'' کے شعوری اور ارادی عمل کو اس زمان ومکان کے نئے تصور کی بنیاد قرار دیا۔ یعنی طاغوت اور ظلم کی جگہ عدل و انصاف کو اور بغاوت کی جگہ اطاعت کے اختیار کر لینے کو صحیح معنی میں ہجرت قرار دیا۔ دارالکفر اور دارالاسلام کو محض جغرافیائی حد بندی نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ دارالاسلام اس نئے زمان ومکان کے تصور کی بنا پر اس نظریاتی تقسیم کی علامت بن گیا جو معرکہ حق وباطل کو واضح کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی تہذیب نے جغرافیائی خطوں کے وجود کو بھی مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ خود قرآن کریم نے القدس کو اقصیٰ یعنی دور، فاصلہ والی مسجد قرار دیا اور دیگر خطوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے وہ جغرافیائی تقسیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں مثلاً ماوراالنہر یا مغرب۔ چنانچہ شمالی افریقہ کے ممالک مراکش، تیونس وغیرہ کو ہماری تاریخ میں مغرب سے تعبیر کیا گیا۔

امت مسلمہ کے سیاسی زوال کے ساتھ جب یورپی سامراج نے مسلم ممالک پر غاصبانہ قبضہ کیا تو یورپ کو دنیا کا مرکز مانتے ہوئے مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا وغیرہ کی اصطلاحات کو متعارف کرایا اور ہم نے بھی ان کی اقتداء میں خود کو مشرق اور یورپ اور یورپی اقوام کو مغرب ومغربی کہنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ مغرب ترقی اور مشرق روایت پرستی کی علامت بن گیا۔ حد یہ کہ یورپی اقوام کی سیاسی غلامی سے نجات کے بعد بھی ہم خود کو اس فکری غلامی سے آزاد نہ کر سکے۔ گو یورپی اقوام کا Eurocentric ہونا ایک فطری امر تھا لیکن مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمان ہوں یا ایشیا، افریقہ اور دیگر مقامات کے انسان، ہماری نگاہ میں، ان کا عالمی سطح پر مغربی تصور زمان ومکان کو معیار مان لینا ذہنی اور ثقافتی غلامی کی علامت ہے۔

آج علمی مباحث میں جب کبھی مغرب کا حوالہ آتا ہے تو اس سے مراد یورپی اقوام اور ان کی فکر ہی لی جاتی ہے لیکن یہ کہنا کہ یورپ میں سب کی فکر ایک ہے اور وہ یکساں تصور حیات اور ترجیحات رکھتے ہیں۔ دوراز کار بات ہے۔ گو مادہ پرستی، لادینیت اور اخلاقی اضافیت تین ایسی فکری بنیادیں کہی جا سکتی ہیں جو یورپ میں پیدا ہونے والی اکثر تحریکات میں مشترک نظر آتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام ہو یا مارکسی یا فاشسٹ تصورات ان سب میں مادیت (Secularism) اور اچھائی اور برائی کے حوالے سے اضافیت کا احساس واضح طور پر قدر مشترک ہے۔ اس لیے بعض مغربی مفکرین کا یہ تاثر کہ سابقہ سوویت یونین کا زوال اور منتشر ہو جانا سرمایہ دارانہ تہذیب کی فتح ہے، ایک ایسا موضوع ہے جس پر کھلے ذہن کے ساتھ مزید گفتگو اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اگر اس مفروضے کو مان لیا جائے کہ سوویت یونین کا منتشر ہونا مغربی لادینیت یا جمہوریت کی فتح ہے تو اس کے فطری نتیجہ کے طور پر یہ بات بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ آنے والی صدی مغربی جمہوریت اور لادینیت کی صدی ہے۔ جب کہ حقیقت حال اس سے بہت مختلف ہے۔ عالمی اسلامی احیائی تحریکات کے نتیجہ میں یورپ وامریکہ میں شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں شعوری طور پر اسلامی ثقافت وعقیدہ اور نظریۂ حیات کو انفرادی واجتماعی سطح پر اختیار کرتے ہوئے کم از کم محدود معاشرتی سطح پر ایک متبادل ماڈل وجود میں نہ آیا ہو۔

اس متبادل ماڈل کی بنا پر عملاً ایک ثقافتی dialogue وجود میں آچکا ہے۔ اس ثقافتی مکالمہ کے نتیجہ میں بعض یورپی اور امریکی دانش وروں اور مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے افراد نے اسلام قبول کیا اور اسلامی ثقافت کے یورپ اور امریکہ میں قابل محسوس شکل میں وجود نے یورپی وامریکی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دانش وروں کو اسلام اور اسلامی تہذیب کے ساتھ مکالمے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے۔ کل تک جو اقوام عسکری اور تجارتی قوت کے ذریعہ مسلم دنیا کو اپنا محکوم بنانے میں مصروف تھیں اب وہ اسلامی تہذیب و تحریکات سے علمی سطح پر تبادلہ خیالات اور مکالمے کو وقت کی ضرورت سمجھ رہی ہیں۔

اس مکالمے کی بنیاد اغلباً حاکم و محکوم کا رشتہ نہیں بلکہ اس کا مقصد بظاہر دو تہذیبوں کے اصولوں، اقدار اور طرز حیات کی بنیاد پر ایک دوسرے کو سمجھنے اور تعاون کے راستے تلاش کرنے کی خواہش ہے۔ تہذیبوں اور ثقافتوں کے اس مکالمے کے مثبت نتائج اسی وقت نکل سکتے ہیں جب دونوں جانب سے، تعصبات سے بلند ہو کر، بہر صورت غالب ہونے کی خواہش پر قابو پاتے ہوئے، کھلے دل و دماغ کے ساتھ اقدار حیات کی بنیاد پر ایک تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

تقابلی مطالعہ کے لیے ایک بنیادی شرط دو تہذیبوں کے درمیان ایک دوسرے کے احترام کا تعلق ہے۔ اگر ایک تہذیب نقطہ آغاز سے ہی دوسری تہذیب کو کم تر، قلاش، اور کمزور تصور کرلے گی تو تقابل کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ جس dialouge کا عملاً آغاز ہو چکا ہے اسے جاری رکھنے اور مفید بنانے کے لیے ضروری ہے کہ یورپی اقوام اپنے احساس برتری سے نجات پا کر اور مسلم مفکرین یورپ کے بارے میں اپنے تلخ تجربات کو نظر انداز کرتے ہوئے اصولی اور عملی سطح پر ایک دوسرے کے موقف سے واقفیت حاصل کریں۔

بیسویں صدی میں لادینی جمہوری نظام کی جو ہولناکیاں تاریخ کی ناقابل تردید حقیقتوں میں تبدیل ہو گئیں ان میں سب سے نمایاں وہ نسلی عصبیت ہے، جس نے کبھی یورپ میں نازی نسل پرستوں کے ہاتھ یہودیوں کو نشانہ بنایا اور کبھی فلسطین، بوسنیا ہرزیگووینا، کوسووا اور چیچنیا میں مسلمانوں کو ظلم و بربریت کا ہدف بنایا۔ اس تعصب کی بنا پر نام نہاد ''عالمی انسانی برادری'' مشرقی تیمور میں تو چند لمحات میں چھ ہزار سے زائد امن فوجی بھیجنے میں کامیاب ہو گئی لیکن ۵۲ سال تک ۹۰ ہزار مسلمانوں کا خون بہنے کے باوجود مسئلہ کشمیر کو خود اپنی قراردادوں کی روشنی میں حل نہ کرا سکی۔

ہمیں اس گہرے تعصب کا تجزیہ کرتے ہوئے معروضی طور پر یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا لادینی جمہوریت کی ان ہولناکیوں کو اسلامی تہذیب و ثقافت اکیسویں صدی کے تناظر میں امن، عدل اور رواداری میں تبدیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرسکتی ہے؟

پاکستان کے حوالے سے ہمیں بالخصوص یہ سوچنا ہوگا کہ یورپ کی لادینی جمہوریت کو مکالمے کی دعوت دیتے وقت کیا اپنے ملک میں ہم فرقہ واریت، مسلکی منافرت اور مذہبی شدت پسندی کو ایک بین المسلکی مکالمے کے ذریعے کم یا ختم کر سکتے ہیں۔ اگر دو تہذیبوں کے درمیان مکالمہ ہوسکتا ہے تو خود اس تہذیب کے اندر اس کے اپنے اعضاء کے درمیان یہ مکالمہ کیوں نہیں ہوسکتا۔ تاریخ کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جو اقوام خود احتسابی کے ذریعے خود اپنی خامیوں، کمزوریوں اور حکمت عملی کی غلطیوں کا جائزہ نہیں لے سکتیں وہ دیگر اقوام کے ساتھ بھی کسی مکالمے میں شریک نہیں ہوسکتیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سوچنے سمجھنے والے افراد آئندہ نسلوں کے تحفظ و ترقی کے پیش نظر اپنے ذاتی مفادات سے بلند ہوکر خود ملت اسلامیہ کے اندر ایک مکالمے کی فضا پیدا کریں تاکہ بتدریج ایک ایسی فکری اور عملی ہم آہنگی پیدا ہو سکے جو قومی وجود اور تشخص کی نمائندہ کہی جا سکے۔

اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے اس شمارے کے ساتھ جو ۱۹۹۹ء کا آخری شمارہ ہے، ہم مغرب اور اسلام کی اشاعت کے تیسرے سال میں قدم رکھ رہے ہیں۔ ہر نئی کوشش اصلاحی عمل کے ادوار سے گزرتی ہے۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ ہم جہاں تک ممکن ہو معروضی طور پر دوسروں کی بات سنیں اور بغیر کسی تکلف اور معذرت کے اپنی بات ان تک پہنچائیں۔ اس عمل میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ ہمارے قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں اس سلسلہ میں اپنی تنقیدی آراء اور مشوروں سے ضرور نوازیں گے۔

ہم اپنے قارئین سے یہ گزارش بھی کریں گے کہ وہ اس رسالہ کو متعارف کرانے اور مختلف علمی اداروں اور تعلیم گاہوں تک پہنچانے میں ہماری مدد اور راہنمائی فرمائیں۔

© rasailojaraid.com